

ماہنامہ



UrduPhoto.com



دادی جان نے گھبرا کر اپنے ارد گرد ہاتھ مارے،
اور چشمہ مل جانے پر فٹا فٹ اسے آنکھوں پر فٹ کیا
پھر سامنے کھڑی لڑکی کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔
وہ بے نیازی سے پنسل ہیل پر کھڑی ہاتھ میں پکڑی
گاڑی کی چابی گھماتی رہی۔

مارے خیرت کے دادی کی انگلی ناک کی پھنگ پر
پہنچ گئی اور منہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اتنی دیر میں تاج بیگم
پکبن سے برآمد ہو چکی تھیں۔
”ہائے آنٹی!“ وہ لڑکی آگے بڑھی اور تاج بیگم کے

گالوں سے اپنے گال مس کر لے گئی۔
دادی کا منہ مزید کھل گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔
تاج بیگم بھی بے تکلفی کے ان مظاہروں کی عادی نہ
تھیں۔ وہ کچھ جھینپیں، کچھ شرماں،
”بیٹھو بیٹی!“ وہ بمشکل بویں۔
”جسید آتا ہی

ہوگا۔“

”ہاں مگر تمہیں اس سے کام کیا ہے؟“ دادی جو
باری باری دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ دخل اندازی
کیے بتا رہی نہ سکیں۔

”نہیں آنٹی! بس میں چلوں گی۔“ اس نے دادی کو
قطعاً ”لفٹ نہ کرائی اور بدستور تاج بیگم سے محو گفتگو
رہی۔ ”اُدھر سے گزر رہی تھی تو سوچا بیچ کر لوں۔“
”کیا سوچا؟“ دادی کو اس کی بات پلے نہ پڑی۔ بڑی
بے تابی سے انہوں نے پوچھا۔

اس نے ایک نگاہ غلط دادی پر ڈالی اور ان کی بات کا
جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا۔

”کوئی چائے، ٹھنڈا پتی جاؤ بیٹی!“ تاج بیگم نے
میزبانی کے تقاضے نبائے۔

”ارے بہو! اس سے پوچھو آخر اسے کام کیا ہے؟“
ہمیں بھی تو بتانا چاہیے۔ ہمارا بچہ ہے وہ۔“

”نہیں آنٹی تھینک یو!“ اس نے پھر تاج بیگم سے

ناولٹ

کہا گویا داری سے اس کا مواضعاتی نظام قطعاً نہیں جڑ رہا تھا۔ ”او کے باپ نے!“ وہ حسینہ دو پینسلوں پر کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔ داری کی پتیلی ہوئی نگاہوں نے آخر دم تک اس کا تعاقب کیا۔

تعاقب کیا۔
 ”اری لشماقہ!“ پھر وہ ہوش میں آکر نہایت جل
 کر بولیں۔ ”پشت ڈھاننے کو کوئی چادر نہ ملی تجھے، گلے
 میں دو بالشت کا پھندا باندھ کر چلی آئی۔“
 انہیں اس کے گلے میں لپٹے رہے۔ اسی اسکارف کا کچھ
 مقصد سمجھ میں نہ آیا۔
 ”اری بہو! یہ جینڈ کن لڑکیوں کے چکروں میں لگا
 ہوا ہے؟“ انہیں سخت تاؤ آ رہا تھا۔

ہوا ہے؟ انہیں سخت مارا دیا گیا۔
 ”اوفوہ اماں! آپ تو رانی کا پہاڑ بنا لیتی ہیں۔“ انہیں
 بیزاری ہوئی۔ ”شام کے اسٹینڈیٹ میں اس کے ساتھ
 پڑھتی ہے یہ“ اللہ جانے کیا مشکل سا نام ہے۔ ایک
 مرتبہ پہلے بھی آئی تھی تب آپ سو رہی تھیں۔ اس
 کے نوٹس جنید کے پاس ہیں وہی لینے آئی تھی۔“
 ”ہاں تو سو یاد آئے، ہم بھی گھر آئے کو عزت دیتے
 ہیں۔ ارے علیہ تو شریفوں کا سا بنائے۔ کم بخت بابرہ
 شریف بنی پھر رہی ہے۔“

”آج کل کی لڑکیاں ایسے ہی فیشن کرتی ہیں
اماں۔“ تاج بیگم بے نیازی سے بولیں۔ ”قلمیں دیکھ
دیکھ کر بگڑی ہوئی ہیں۔“

”آستینیں دیکھی تھیں مردار کی؟ گویا ٹمکھ لگوانے آئی ہو۔ قمیص کے چاک گویا مجنوں کا چاک ہوئے۔ کم بخت کی شلوار کانیفہ نظر آتا تھا۔ اور پائنجے؟ پنڈلیوں پر یوں جڑھے ہوئے تھے جیسے اپنے گھر کا مین دھوتے دھوتے چلی آئی ہو۔ بالشت بھر کا رومال گلے میں کس لیا، سب فرض پورے ہو گئے۔ اور ہوا!“ انہیں یکایک خیال آیا۔ ”یہ اس غریب کے بالوں کو کیا ہو گیا؟ ایک پٹی سفید، ایک کالا یہ کون سی بیماری ہے؟“

”بیماری نہیں اماں جان افیشن سے یہ بھی۔ خود
رنگواتی ہیں لڑکیاں۔ کبھی سنہری کبھی روپہلی۔“

ہائیں؟“ دادی کچھ دیر محو حیرت رہیں۔ ”کیسی
فتنہ لڑکی ہے! آنے دو جنید کو میں پوچھتی ہوں اس سے
بھلا پرانی لڑکیوں سے نوٹ لینے کا اس کا کیا کام؟ پیسے
چاہیں تو باپ سے مانگے، فقیر بنا پھر تا ہے۔“
”نوٹ نہیں اماں۔ نوٹس!“ تاج بیگم نے دہل
دی۔ ”آپ نہیں سمجھیں گی۔“

”ہاں بہو! ایک تم ہی بقراط ہو۔“ انہوں نے پان کا ٹکڑا غصے سے توڑا۔ ”ہم تو اب جاہل ٹھہرے، ہاں۔“ وہ زمانے لد گئے جب زمانی بیگم زوجہ صدر الدین کی عقل و فہم کی شہرت محلے بھر میں تھی۔

پان منہ میں رکھ کر ان کے غصے کو کچھ قرار آیا تھا۔

”ہائے ہائے برے نصیب مرے۔“ اس نے اٹھا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر تاسف کا اظہار کیا۔ ”وہ آئے گھر مارے خدا کی قدرت ہم گھر نہیں تھے۔“

”شرم کرو کچھ۔“ تاج بیگم نے اسے گھورا۔ ”بھی ادوی کے ہتھے نہیں چڑھے ورنہ سچ مچ روتے نظر آتے۔ اور سچ پوچھو تو مجھے بھی ایسی بے باک لڑکیوں کا بے تکلفی سے میرے بچوں کے متعلق پوچھنا بالکل پسند نہیں۔ اس کو سمجھا دینا۔ آئندہ یہاں آنے کی غلطی نہ دہرائے۔ اپنی داوی کا تباہے نا؟“

”پتا ہے پتا ہے۔ کوکونٹ کی طرح ہیں بالکل“ اور
سے سخت اندر سے بالکل نرم۔“ اس پر قطعاً اثر نہ
ہوا۔

”چل جائے گا پتا۔“ وہ جل کر کمرے سے نکل گئیں۔

”ہائے ہائے بھائی جان۔“ اس نے جمشید کو بازوؤں سے پکڑ کر پورے کمرے میں گھما ڈالا۔ ”یہ گلیاں یہ دوبارہ یہاں آنا پھر دوبارہ۔ آپ کو تو خبر ہی نہیں کیا یا امت گزر گئی مجھ پر۔“

گول گول گھومنے سے جمشید کا سر چکر اگیا اور چستے
کے پیچھے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر

لے گئے تھے۔

”ہا! آپ کہیں تو وہ سرمہ میں آپ کو لائے دیتا ہوں۔ دو روپے کی پیشی ہے۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔“

”نہیں میرے دوست۔“ اس نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔ ”ان آنکھوں میں اب آنسو ہی رہنے دو۔ انتظار یار کر کر کے اب یہ بے نور ہو چلی ہیں۔ اب کوئی سرمہ کچھ نہیں کر سکتا۔“

”یہ آنسو ہیں کہاں بھائی جان؟“ اس نے بغور بھائی کا چہرہ دیکھا۔ ”لاب خشک بڑا ہے۔ کناروں پر کیچڑ جمع ہے۔ خواہشوں کے مینڈک ابھی بھی پھڑکتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ عشق کے اشتیاق سے لبالب بھری یہ آنکھیں اس قدر جلد بے نور نہیں ہو سکتیں۔“ آخر آخری نور بانو کی تین عدد خوبصورت شادی کے قابل لڑکیاں ہماری ادبیری منزل پر کبھی کبھار قیام کرتی ہیں۔“

جمشید کی آنکھیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں۔ لب پھڑپھڑانے لگے۔ چہرے پر شاشت چلی آئی۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو میرے دوست! مایوسی کفر ہے۔ میں کفرانِ نعمت کرنے لگا تھا۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے مجھے صحیح وقت پر چونکا دیا۔“

جند معنی خیزی سے مسکرا رہا۔

”لیکن میرے یار! یہ بھی تو سوچو کیا اچھا لگتا ہے کہ چھوٹا بھائی محبت کی رنگین کہانی کا آغاز کر ڈالے اور بڑے بھائی کے دل کا صفحہ بے رنگ و سادہ ہی رہ جائے۔ آخر تمہیں میری زندگی کے ادھورے پن کا کچھ احساس ہونا چاہیے۔ اس بے رنگ کیفیت کا کچھ تدارک کرو۔“ ان ”تک میرے دل کی آواز پہچانے کی کوئی تدبیر کوئی سبیل کرو۔“

”کہیں تو ان کے کمرے میں وہی ”لاؤڈ اسپیکر“ فٹ کروادوں؟“ اس نے آنکھ ماری۔ ”ایسی آواز پہنچے گی آپ کے دل کی کہ ایک زمانہ سنے گا۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”یار! مجھے اظہارِ محبت

پانچے گا۔

”لیکن وہ ہے کون؟ کہاں مل گئی؟“ اس نے کس لیے اتنی بڑی مڑکی کے متعلق دریافت کرنے کے تجسس نے اسے جند کی حرکت پر برہم ہونے سے باز رکھا۔ وہ ٹھوڑی پر آیا ہوا چشمہ درست کرنے لگا۔

”نام سے نخواستہ خان!“

”ہائیں! کوئی منگول سپہ سالار معلوم ہوتی ہے۔“

وہ احمقانہ پن سے بولا۔

”انسٹیٹیوٹ میں میرے ساتھ پڑھتی ہے۔“ اس نے بھائی کے تبصرے کو چنداں اہمیت نہ دی۔ ”اور رہی بات یہ کہ یہاں کیوں آئی تو میرا خیال ہے بھائی جان! کہ وہ گوڈے گوڈے میرے عشق میں ڈوب چکی ہے اور دیوانوں کی طرح مجھے پکارتی پھر رہی ہے۔ کبھی وہ انسٹیٹیوٹ میں میرا پتا معلوم کرتی ہے۔ کبھی کسی سے میرا فون نمبر معلوم کرتی ہے اور ابھی گھر تک چلی آتی ہے۔“

”چھوٹے بھائی!“ جمشید اطمینان سے بولا۔ ”میرا خیال ہے تم کچھ بھول رہے ہو۔“

”وہ کیا بھائی جان؟“ وہ دو سو روپے جو تم نے اس سے ادھار لیے تھے۔ تمہارا پیچھا اس قدر بے تابی سے کوئی لڑکی محض اسی لیے کر سکتی ہے۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔ بس ہو گئے نا جیلس۔“ اس نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔ ”ارے بھائی جان! وہ اتنی امیر ہے کہ روزانہ مجھے دو سو روپے کا لچ کر سکتی ہے۔ دو سو تو کیا ضرورت پڑنے پر میں اس سے دو لاکھ بھی ادھار مانگ سکتا ہوں۔“

”اچھا! جمشید پر اس کی باتوں کا بالآخر اثر ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں حرارت اتر آئی۔ ”لیکن چھوٹے بھائی! ذرا آئینہ دیکھ کر مجھے یہ تو بتاؤ کہ اسے تم میں نظر کیا آیا؟ کہیں تم نے سبزی منڈی والے چوک پر بیٹھے سامیں دل بردلی مراد سے سرمہ نسخیر محبوب تو نہیں خرید لیا؟ اس روز تم مجھ سے بیس روپے ادھار بھی تو

کرنا ہے۔ خطبہ نہیں پڑھنا۔ کوئی اور ترکیب کرو۔“
 ”اچھا سوچنا پڑے گا۔“ اس نے تھوڑی کھجائی۔
 ”وہ بھائی جان یاد آیا۔ مجھے پچاس روپے چاہیے تھے۔
 جیب میں پھولی کوڑی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں کھل شام
 خجستہ کو کوئلہ ڈرنگ پلاؤں۔“

”ہاں ہاں۔“ اس نے گھبرا کر جیبیں
 ٹٹولیں۔ ”لیکن یار! دو کوئلہ ڈرنگس کے لیے تو بیس
 روپے بھی کافی ہیں یہ تم پچاس روپے کیوں مانگ رہے
 ہو؟“

”بھائی جان کوئی ٹپ وغیرہ بھی تو دینی پڑ جاتی ہے۔
 آپ کو ان معاملات کا کیا پتا؟“
 ”آہ!“ اس نے سینے کی جیب ٹٹولتے ہوئے یکایک
 دل تھاما۔ ”یہ کیسی چوٹ کی ہے میرے بھائی۔ اب چار
 پہرچی کو قرار نہ آئے گا۔“

”آپ پیسے دیں بھائی جان! اس قدر جذباتی ہونے
 کی ضرورت نہیں۔ وہ جبر سنانے جا رہا ہوں کہ چار تو کیا
 آٹھ روپی سولہ پہر آپ مسرت سے ناچتے پھریں
 گے۔“

”اچھا! سچ کہتے ہو؟ وہ پراشتیاق ہوں
 سو فیصد!“
 ”تو جلدی کہو؟“

”آپ کو ڈانس کی اتنی جلدی ہے؟“ وہ شرارتی ہوا
 پھر اس کے بگڑتے تیور دیکھ کر جلدی سے انصافیت کی
 جون میں آگیا۔ ”وہ میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ ”غزل نیوز
 ایجنسی“ کے مطابق تینوں حسینا میں ہفتہ بھر کی چھٹی پر
 کل پہنچ رہی ہیں۔“

”سچ کہہ رہے ہو میرے بھائی؟“ جمشید نے جوش
 جذبات میں اس کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔
 جنید نے اس کی جیب سے جھانکتا نوٹ نکال لیا۔
 ”آپ کی قسم۔“

”میں اڈی اڈی جاواں ہوا دے نال۔“ جمشید کے
 گانے پر اڑائیں بھرتا وہ کمرے سے نکل گیا۔



”ارے شکورہ! پو نہی تو مائیں اپنی بیٹیوں کو
 آٹھ کھلی کے کرتے نہیں پہناتی تھیں۔ کوئی بھید کوئی
 راز تھا تا اس کے پیچھے؟ مار پڑے آج کل کی فیشن
 پیٹیوں کو۔ کلیوں والی گھیس تو دور کی بات ہے، کلیوں
 والی شلوار بھی گئی۔ مولی مولی پنڈلیاں گئے ہیں۔“

”ٹھیک کہا بی بی جان آپ نے۔ ایکسپان دیجئے۔“
 ”پان؟“ راؤنی چو نکلیں۔ ”ارے شکورہ! تم کچھ
 زیادہ پان نہیں کھانے لگیں؟ پچھلے ایک گھنٹے میں یہ
 تمہارا تیسرا پان ہے۔ خیر!“ انہوں نے مارے بازو
 جی سے پاندان کھولا۔ ”دینے میں مجھے عار نہیں، لیکن
 یہ کم بخت کوئی کام کی چیز بھی نہیں، جو بکری کی طرح
 جگالی کے جارہی ہو۔ اچھا یہ لو۔“ انہوں نے بالکل
 غصے سے ایک ننھا منسا پان اپنی ہم سخن کی نذر کیا۔
 ”ہاں تو کیا کہہ رہی تھی میں؟“

”آپ؟ آپ وہسے وہسے؟“ انہوں نے جان بوجھ کر
 منہ میں بیک بھری۔

”ہاں یاد آیا۔ اس لفنگی کی داستان سن رہی تھی
 تمہیں۔ ارے میں یہاں سخت پر بیٹھی اس ”فٹنی“
 سے دس باتیں پوچھیں، مجال ہے جو اس نے میری
 ایک بات کا جواب دیا ہو۔ تاج کو ”انٹی“ ”انٹی“ کر کے
 چلتی بنی۔ آج کل کی چھو کریوں کو کچھ بزرگوں کا لحاظ
 ہے۔“

”لڑکے سے پوچھا آپ نے؟“ شکورہ بی نے بیک
 نگل کر ادھر ادھر دیکھا اور رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”ارے پوچھ لیں گے۔“ انہوں نے کبھی
 اڑائی۔ ”ہمارے لڑکے ایسے نہیں شکورہ! معصوم بچے
 ہیں وہ غریب کچھ نوٹ لے آیا تھا اس سے۔ بڑگئی ہوگی
 ضرورت ادھر۔ کیا کہتے ہیں۔ ارے جہاں ”کمپیوٹر“
 سیکھنے جاتا ہے۔ حالانکہ باپ نے کبھی کمی نہیں کی۔

میرا قطب الدین بڑا خیال رکھتا ہے اپنے بچوں کا۔ پھر
 بھی سو ضرورتیں ہوتی ہیں بچوں کی۔ وہ ”ننھلین“ گھر
 پہنچ گئی پیسے واپس لینے۔ انگلی پر چالی یوں بھٹا رہی تھی

یہاں آکر بیٹھو دو گھڑی۔“

جنید کو جان بچانے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔
ناچار گردن کھجاتا وہ ان کے پاس جا بیٹھا۔

”امی! کھانا! بھوک لگی ہے۔“ اس نے دادی
جان کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

اس کی آواز سن کر جمشید بھی چلا آیا۔ وہ بھی تخت پر
چڑھ گیا۔

”پڑھائی اچھی کرتے ہو؟“ انہوں نے پوتے کو
مشکوٰۃ نگاہوں سے گھورا۔

”میری پیاری دادی!“ وہ پھرتی سے ان کے پاس

ہم اس کا کرتب دیکھنے کو بیٹھے ہوں۔ گردن میں
روٹیاں بھانسی کے چھندے کی طرح گھسا ہوا، کمر پر قمیص
کسی ہوئی تو۔ ارے سلی کمر ہماری بھی تھی لیکن
مجال ہے جو کسی کو زندگی بھر خبر ہوئی ہو۔ سوائے
تمہارے ابا کے۔ ان کی تو ٹھہری میں سما جاتی تھی میری

”میرے ابا میاں؟“ شکورہ بی کو غشی محسوس

ہوئی۔
”ارے ہمارے سرناج، صدر الدین جنت

مرکزی۔“ دادی نے چھنگلی پر سے چونا چاٹا۔
”چھابی بی جان، میں اب چلوں۔ گھر پر لڑکیاں اکیلی

ہیں۔“
شکورہ بی داستان کی بے رحمی سے اکتا کر اٹھ

کھڑی ہوئیں۔ اب بھلا لڑکی کا محض حلیہ کہاں تک
سنے جاتیں۔ دادی اپنے پوتے کو تو صاف بچا کر لے گئی

تھیں۔ داستان میں کچھ سی مفقود تھی۔
”چلتی ہو؟ اچھا جاؤ پھر آنا خیر سے ایک تو یہ پان

بہت منگے ہو گئے ہیں۔ جانو جی کو جنجال ہی لگایا، ہم نے
کس کام کا مواشوقہ جان کا بھی زیاں پیسے کا بھی۔“

شکورہ بی ناکب بھوں چڑھا کر رخصت ہوئیں۔
دادی باندان کے نچلے حصے سے ریزگاری نکال کر گننے

لگی تھیں۔

رضیہ جمیل کے شاہکار افسانے

بدریا برس گئی اس پار

شائع ہو گیا ہے

نمونہ تصویر گیت آپ

بہنوں کے لئے خوبصورت تحفہ

قیمت: 150 روپے

اس کے علاوہ 2 مکمل ناولوں کے

ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

اک گھروندہ برف کا: 300 روپے

ساگر دریا بادل بوند: 300 روپے

منگوانے کا تہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار۔ کراچی

سلی پر کوئی شوخ سی دھن بجاتا وہ بے حد خوشگوار

موڈ میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ تخت پر براجمان دادی کو

ہشیار باش پا کر اس کی شوخی ہوا ہو گئی۔ کتابوں کو

سنجانے میں مشغول ہو کر وہ ان کے قریب سے

گزرنے لگا۔
”ارے اومیاں چھیلے۔“ پاٹ دار آواز پر وہ گڑبڑا کر

رک گیا۔
”دادی جان! اوہ! السلام علیکم۔“
”وعلیکم السلام۔ کہاں بچتے بچاتے نکل رہے ہو؟“

آگیا۔ ”صبح و شام، دن رات، کتابیں، کتابیں اور کتابیں۔ صبح کرنا شام کالانا ہے جوئے شیر کا۔“
 ”ہوں۔“ انہوں نے چٹنے کے عقب سے اسے دیکھا۔ ”وہ جو نازنین کل تمہارا پوچھتی پھرتی تھی۔ وہ کون ہے؟“ جنید نے کچھ نہ سمجھنے کی اداکاری کرتے ہوئے کان کھجایا۔

”یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟“ اس نے جمشید سے پوچھا۔ ”غمزہ و عشوہ ادا کیا ہے؟“
 ”ناس پیٹے! ٹھیک ٹھیک بول۔“ بالآخر اسے ایک دھمو کا ملا۔ ”کیوں راہ و رسم بر بھائی ہے تو نے اس سے ہنوت مانگنے کو کوئی مرد بچہ نہیں ملا؟ لڑکی کے سامنے فقیر کیوں بنا تو؟“

”بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب!“ اس نے آہ بھر کر کمر سہلائی۔ ”تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔ لیکن پیاری دادی! نوٹس تو اس نے مجھ سے مانگے ہیں۔ میری رات رات بھر کی ریاضتیں یہ کس نے آپ کو غلط فہم کیا ہے؟“

”تیری ماں ہی کہہ رہی تھی کہ تو نے اس سے ادھار رقم لی ہے۔“ وہ کچھ مطمئن ہو میں۔ ”پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناقہ۔“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا۔“

”اچھا! اب آئے گی تو میں خود پوچھوں گی اس سے۔“
 ”تساقہ کہیں کی۔ کہہ گئی ہے پھر آنے کا۔“

”کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا۔“ اس نے سرد آہ بھری۔

”اور مردود! تجھے شرم نہ آئی ایسی بے باک لڑکی سے دوستانہ کرتے۔“ اسے پھر ایک دو ہتھڑے نوازا گیا۔ ”گلے میں بالشت بھر کا رومال باندھ آئی تھی بے شرم۔“

”ہائے!“ جنید نے آنکھیں گول کیں۔ ”اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب۔“
 ”مردار! کیا بکے جا رہا ہے؟“ وہ غضب ناک ہو میں۔

”کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔“
 جمشید حیرانی سے آنکھیں پھاڑے بھائی کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”یار جنید!“ وہ خوشامدی انداز میں اس کے پاس بیٹھا۔ ”یار! یہ اتنے اچھے اچھے شعر کہاں سے یاد کیے؟“

”ہائے بھائی جان!“ اس نے سر کھجایا۔ ”میں کہاں اور یہ وہاں کہاں۔ نازنیوں کو متاثر کرنا بھی کوئی اس کا کام ہے؟ غالب کا جگر خونم خون ہو گیا۔ ذرا دیوان اٹھا کر دیکھیے۔ ہفتہ بھر سے سر کھپا رہا ہوں تب کہیں جا کر ایک دو غزلیں ملتی ہیں۔“

”تم نے تو رٹ لیں پار! میرا کیا ہو گا؟“ وہ مایوس ہوا۔ ”مجھے تو چڑیا گھر کے شیر کا حلیہ یاد نہیں۔ آنکھیں بند کر کے سوچوں تو ملی ذہن میں آ جاتی ہے۔ میں ایسے شعر کہاں یاد رکھ سکتا ہوں؟“

”تو آپ کو یاد کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“ اس نے برا سامنے بنایا۔

”ارے واہ۔ خود تو غالب کا دیوان یاد کر رہے ہو گو مجھ سے پوچھتے ہو کیا ضرورت ہے! تم اس خستہ خان غالب کے شعر سناؤ اور میں اپنی شمو کو چھ نہ سناؤں۔“

”آپ کی شمو؟ اوہ اچھا اچھا! شمشاد بیگم کا ذکر کر رہے ہیں آپ آپ اسے موسم کا حال سنائیں بھائی جان! لی وی والے روز بتاتے ہیں؟“

”میرے پچاس روپے فوراً واپس کرو۔“ جمشید طیش آگیا۔ ”اور اس سے پہلے والے بیس روپے بھی ابھی نکالو۔“

”اوہو ہو۔۔۔ بھائی جان! میرے پارے بھائی آ رہے تو خفا ہو گئے۔ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ اچھا تو آ رہے شمو کو شعرو شاعری سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں تو میں کیا مشکل ہے؟ میں آپ کو ایک سادہ صفحے پر آ دس اچھے اچھے اشعار لکھ دیتا ہوں۔ سنا ڈالیے ملے تو آداب کیجئے یوں۔“

اس نے ایک خاص ادا سے بال جھٹک کر انگلیاں
ساتھ سے لگائیں۔
”لیکن یار! سناؤں کسے؟ تمہاری وہ جھستہ خان تو
روز انسٹیٹیوٹ میں ملتی ہے تمہیں۔ شمو تو کبھی
سیڑھیوں پر بھی نہیں ملتی۔“ وہ بیزاری سے بولا۔

”اچھا تو یہ بات ہے؟“ اس نے کچھ دیر غور کیا۔ ”تو
بھائی جان! آپ تو یوں بھی سولہویں صدی کے رومیو
ہیں۔ اظہارِ محبت کے لیے طریقہ بھی فرسودہ اختیار
نیچتے۔ آپ کی عقل و فراست کا پردہ بھی رہ جائے گا،
اور سینے کے طمانچے کا خوف بھی جاتا رہے گا۔“

”اچھا!“ جمشید اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کی
گردن میں بازو جمائے لیا۔ ”تو جلدی کہو میرے دانا
دوست مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”ایک عدد خط تحریر کیجئے۔ اس میں اپنی شکایت
ہائے رنگیں بیان کیجئے، تغافل ہائے ساقی کا کلمہ کیجئے دل
گم گشتہ کا سراغ مانگیے۔ لکھناڑ کی قصیدہ خوانی کیجئے۔“
جمشید نے اپنا بازو اس کی گردن سے نکال لیا اور
اسے بری طرح گھورنے لگا۔

”یار جنید! مجھے جامع مسجد کے خطیب کو خط نہیں
لکھنا یار! کوئی آسان بات بتا گیا لکھوں؟“
”آسان بات؟“ اس نے کان کھجایا۔ ”آئی لو یو
سے آسان بات کوئی نہیں بھائی جان! سیدھا سیدھا
لکھ بھیجیں۔“

”نہیں یار تو سمجھ نہیں رہا۔ کوئی پھر گئی تحریر کوئی
ایسی متاثر کن بات کہ بس تڑپ اٹھے ظالم۔“
”مرغ کی سالم کیجی شیخ ویس۔“ وہ طنزاً بولا۔
”اپنے جگر کے نام سے۔“

”میں پیسے مانگ لوں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔
”میں مزید پیسے لوں گا۔“ وہ بھی اکڑا۔ ”سوروپے
میں ایک عدد خط بمولیس منظور ہے؟“
”سوروپے؟“ جمشید پریشان ہو گیا۔ ”یار! یہ تو بہت
ہیں۔ پتا نہیں کتنے خطوں کی ضرورت پڑے یوں کرو سو
روپے میں چار خط۔“

”میں خالی خولی منشی ہوں کیا۔“ وہ بے رخی سے بولا

اور کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔

”اچھا چلو دو خط۔ اب تو مان جاؤ۔“

”ہوں!“ اس نے نخرے سے سر ہلایا۔

جمشید نے خوشی سے کھل کر اس کا گل چوم لیا۔



”آئے موسم رنگیلے سہانے۔ جیا ناہیں مانے۔ تو
چھٹی لے کر آجا بالما۔“ غزل بے حد موڈ میں گنگناتی
ہوئی کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

باہر کچن میں اپنے تخت پر براجمان پنج سورہ پڑھتی
دادی کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے چشمے کے
اوپر سے عقابی نگاہیں بنا کر کچن کے دروازے کو کچھ دیر
گھور کر گانا بند ہونے کا انتظار کیا، لیکن اندر اپنے کام
میں منہمک غزل ان کے اندرونی تلاطم سے بے نیاز و
بے خبر تھی۔ وہ بدستور گنگناتی رہی۔

”ہوں ہوں۔۔۔ ہوں ہوں۔۔۔“ بالآخر دادی جان
نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا پنج سورہ کے دوران
گفتگو کرنا ان کے نزدیک آداب کے خلاف بات
تھی۔

”کیس پھول کو بھنورا چوم گیا۔“

دادی جان کے چہرے کے تاثرات غضب ناک
ہوئے۔ ان کا زور زور سے ہلنا بھی موقوف ہوا۔

”میرا دل مستی میں جھوم گیا۔ کوئی میری خوشی کو نہ
جانتے۔“

دادی جان نہایت غصے میں پنج سورہ جزدان میں لپیٹنے
لگیں۔

”مردار کہیں کی۔ ذرا ادھر آتو۔“ انہوں نے
کڑک دار آواز میں کہا۔

غزل کونل کے شور میں ان کی بات سمجھ میں نہ
آئی۔ وہ اب ساس پین مانجھنے میں مشغول تھی۔

”بڑے ارمانوں سے رکھا ہے بلم تیری قسم۔ پیار کی
دنیا میں یہ پہلا قدم۔ پہلا قدم۔“

اس کی کمر پر ایک زوردار دھمو کا پڑا۔ وہ اچانک
افتاد سے بوکھلا کر رہ گئی۔

”مردود کہیں کی۔ کانوں میں تیل نہیں ڈالا جاتا تجھ سے؟ بہری بنی گھڑی ہے۔ دے گانے پہ گانا۔ دے گانے پہ گانا۔ میرا اللہ رسول کا نام لیتا دو بھر کر ڈالا تو تے تاجار۔“

وہ بے حد غضب ناک ہو رہی تھیں۔ اندر آتی تاج بیگم نے بھی غزل کو گھور کر دیکھا۔
”یہ کیا ہر وقت گانے گاتی رہتی ہو غزل؟ زبان کو دو گھڑی قرار نہیں ہے؟“

”اری تاج! گانے بھی وہ گاتی ہے جس میں گھوم بھر کر اسی مردود کا ذکر ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں خدا خدا کر کے تو وہ کیا ہے گھر سے۔ شیطان تو ہے پورا اکتا ذکر ہو گا تو پھر چلا آئے گا۔“

تاج بیگم اور غزل کے چہرے پر کچھ نہ سمجھ میں آنے والے تاثرات پیدا ہوئے تھے۔
”میں کس کا ذکر کروں گی دادی؟“ وہ کمر سہلائے ہوئے یونی آواز میں بولی۔ ”میں تو آپ کی پسند کا گانا

گارہی تھی۔ آپ سے ہی سیکھا تھا میں نے۔“
”آں ہاں میں ہی گنگناتی تھی۔“ انہوں نے اقرار کیا۔ ”لیکن جب سے وہ مردود بنا کا اس گھر میں آیا ہے میں نے اپنی پسند لیٹ کر ایک طرف رکھ دی۔“
”کیوں۔۔۔ وہ بے چارہ کیا کہتا ہے؟“ تاج بیگم نے

ناک بھوں چڑھائی۔
”اری ہر گانے میں تو بالم بالم کہتا ہے۔ ذہن میں اس خبیث کی ہستی آجاتی ہے۔“

غزل اپنی کمر کا دھوکا بھول بھال زور زور سے ہنسنے لگی۔ تاج بیگم بھی مسکرائے نہ رہیں۔
”خدا خدا کر کے تو وہ چھٹی پر کیا ہے۔ اس کی کچھ دیر کو گلو خلاصی ہوئی ہے نہ گایا کرو بالم بالم والے گانے۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن سے نکلیں۔
”کیا ذکر اذکار کرے کوئی ایسے گھر میں۔“

”گورے گورے۔۔۔ او بالے چھوڑے۔۔۔ کبھی میری گلی آیا کرو۔“ غزل شرارت سے گنگناتے ہوئے اندر کو بھاگی۔ دادی نے جل کر جوتی اٹھانے کو ہاتھ

برمھایا تب تک وہ بھاگ چکی تھی۔
دادی نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا پاندان کھولا اور چہرے کی سوکھی کھسیا پتلی سے رگڑنے لگیں۔
”اوسے میں کیا۔ چاچی جی۔ ایسہ بوا (دروازہ) کھولیں۔“ (میں نے کہا، چاچی جی یہ دروازہ کھول دیں۔)

دادی جان نے حیرت اور خفگی سے ادھر ادھر دیکھا گویا آواز کا مبدلہ ہونے کی کوشش کی۔
”او جی۔۔۔ استھہ استھہ۔۔۔ میں استھہ آں۔“ (ادھر ہوں۔)

دادی نے ہاتھ کا چھتجا بنا کر اوپر کی سمت دیکھا۔ خورشید علی صاحب کے بڑے بھائی عرف چاچی اپنے روایتی لباس میں ملبوس وہاں کھڑے ہاتھ ہلاتے تھے۔
”کیا ہے؟“ دادی برسیں۔ ”کیوں حلق پھاڑ رہا ہے؟“

”او چاچی جی بھیل آکھیا۔ بوا باہر دواں بندائے کھول دیں۔ (چاچی جی میں بتا رہا ہوں باہر سے دروازہ بند ہے۔ کھول دیں۔)

”ہائیں!“ دادی نے ناک پر انگلی جمائی۔ ”کون سی بوا کہاں بند ہے بھائی؟“
”چاچی جی۔ ایسہ بوا۔“ انہوں نے بے بسی سے کہا۔

”اے بوا ارے چاچی بول یا بوا بول۔ کوئی ایک بات بولو۔ کبھی چاچی کہتا ہے کبھی بوا کہتا ہے۔ ارے بھائی میں اتنی بڑھی نہیں۔ تم سے دو چار برس ہی آگے ہوں گی۔ لو بتاؤ بھلا۔۔۔ سفید بال ہیں بڑھے کے۔ نکھالے بن رہا ہے۔“

”اونٹیں جی ننیں میں آکھیاں بوا بندائے۔“
”ارے کون سی بوا بند ہے؟“ وہ جھٹلا گئیں۔
”اندر سے نہایت تیزی سے تاج بیگم برآمد ہوئیں۔
”رہنے دیں آپ۔“ انہوں نے ساس کو بد مزگی سے کہا۔ ”وہ بے چارے اوپر بند ہیں۔ کام والی ماسی باہر سے دروازے کی گنڈی لگا گئی ہے۔ دو بہری جانب سے نور بانو آوازیں دے رہی ہیں۔ یہاں سے بھائی صاحب

چلا رہے ہیں۔ آپ کو تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔
میں کھول کر آتی ہوں ان کی کنڈی۔“
”اے لو۔ سب فنکار ہیں یہاں۔“ دادی سر جھٹک
کر پان پر اطمینان سے کتھے کا کوٹ کرنے لگیں۔
”اب میں کیا جانوں؟ سیدھی بات نہیں کرتا۔ بوا بوا
کے جارہا ہے ننھا میاں۔ بھائی سچ سے بول باہر سے
کنڈا اڑا ہے کھول دو ہم سمجھیں بھی باریک دھوتی
لیٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ حواس تو ویسے ہی خبط ہونے
لگتے ہیں نگاہ پڑتے ہی اللہ مغفرت کرے جنت مکانی
صدر الدین صاحب کی کیسے نفیس آوی تھے۔“

☆ ☆ ☆

”کیا کرتی ہو نور بانو؟“ دادی جو بڑی دیر سے ریلنگ
میں سے دکھائی دیتی نور بانو کی سرگرمیوں کو بھانپنے کی
کوشش کر رہی تھیں۔ بالآخر رہ نہ سکیں۔
اتنا اندازہ تو انہیں ہو گیا تھا کہ وہ کوئی اہم کام
سرا انجام دے رہی تھیں۔ ایک مخصوص قسم کی خوشبو
بھی ان کی ناک کو گدگدا کر چاچکی تھی۔ سواب وہ بے
تاب ہو کر انہیں پکار رہی بیٹھی تھیں۔
نور بانو ان کی پکار پر خوش خوش ریلنگ تک چلی
آئیں۔

”اماں جی! اماں! اچار پوندی آں۔ نالے مرچاں
تے لیموں وی آں۔“ (اماں جی! آیم کا اچار ڈال رہی
ہوں ساتھ میں مرچیں اور لیموں بھی ہیں۔)
”اچھا اچھا۔ میں بھی کہوں کھٹی کھٹی خوشبو آرہی
ہے۔ کیسے ڈالتی ہو کوئی خاص ترکیب ہے کیا؟“
”اماں جی! تسی آجاؤ نا۔“ (اسوں نے خوش دلی
سے کہا۔)

”اچھا!“ دادی جان نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ”چلو تم
اتنا اصرار کر رہی ہو تو آجاتی ہوں۔ ویسے سیڑھیاں
چڑھنا مشکل ہے میرے لیے۔“

”آہو جی۔۔۔ پوڑھیاں (سیڑھیاں) داتے مسئلہ
ہے!“ (ہاں جی۔۔۔ سیڑھیوں کا تو مسئلہ ہے۔)
”خیر!“ دادی برا مان گئیں۔ ”اتنی بوڑھی بھی نہیں

ہوں میں۔ اللہ رکھے۔ ہاتھ پیروں سے سلامت ہوں
کسی کی محتاج نہیں۔“

”نہ جی میں کیا پوڑھیاں وامسلہ اے!“

”کیا بوڑھی بوڑھی کیسے جاتی ہو؟“ دادی

جھٹلا گئیں۔ ”خود بڑی نوجوان ہے کم بخت۔“

آگے وہ منہ میں برید پائی تھیں۔ وہ ان کی سیڑھیوں
کی جانب بڑھی تھیں جو ان کے صحن میں اترتی تھیں
ان کو آنا دیکھ کر نور بانو کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

”تاج ذرا ادھر آؤ بھی۔“ قطب الدین صاحب

نے کمرے سے آواز دی تھی۔

تاج بیگم دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی کمرے میں
داخل ہوئیں۔

”ارے بھی سرد رو سے پھٹا جاتا ہے۔ سرد رو کی

گولی لا کرو۔ ایک کپ چائے بنا دو ساتھ میں۔“

”جی اچھا!“ وہ فکر مندی سے بولیں۔ ”گولیاں تو

ختم ہو گئی ہیں۔ میں جمشید سے منگواتی ہوں۔ تب

تک چائے بھی بن جائے گی۔“

”وہ تمہارا لاڈلا لوٹے گا رات گئے۔ کسی ڈھنگ

کے بندے کو بھیجو!“ وہ کرا رہے۔

”لیجئے۔ اب اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں۔

آپ کو تو ہمیشہ اپنی اولاد میں کیڑے دکھائی دیتے ہیں۔“

وہ خفا ہوئیں۔ ”میں ابھی لے آتی ہوں گولی اور

چائے۔“

وہ مڑ کر کمرے سے نکلی تھیں۔

”جمشید۔۔۔ او جمشید۔“

”جی امی۔“ وہ عینک درست کرتا چلا آیا۔

”تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سرد رو سے

بے حال ہو رہے ہیں۔ دوڑ کر گولیوں کا پتہ لے آؤ

میڈیکل اسٹور سے۔ میں تب تک چائے بناتی

ہوں۔“

”جی اچھا۔“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

”جلدی آنا۔ دیر نہ کرنا۔“

”م بھی گیا، ابھی آیا۔“ وہ تیزی سے باہر کی جانب

بڑھ گیا۔

گیت سے باہر نکلتے ہی وہ پتھر کا بت بن گیا۔

باہر کھڑی ٹیکسی میں سے تین عدد حسینا کپڑے برآمد ہو رہی تھیں۔ جمشید کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کے دل میں سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ دوڑ کر جائے اور جنید کو بلا لائے پھر اس نے اپنا خیال خود ہی رد کر دیا۔ جنید کی موجودگی میں اسے ہمیشہ صفر مار کس ملتے تھے۔

ارشاد کی نگاہ اس کے کھلے ہوئے منہ اور پھٹی ہوئی آنکھوں پر پڑی۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اس نے ٹیکسی والے کو پیسے دیتی شمشاد سے کچھ کہا۔ تینوں مڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔ وہ بے طرح شرما گیا۔

”جمشید صاحب! اجی بنتے ہیں۔ ذرا ادھر آئیں۔“ غالباً وہ شمشاد ہی تھی۔

جمشید کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے دائیں دیکھا پھر بائیں پھر ہونق پن سے آسمان کو دیکھا۔ وہ تینوں قہقہہ مار کر ہنس دیں۔

”ہم یہاں ہیں!“ وہ کورس میں بولیں۔

وہ پھر شرمایا، جھجکا، اپنا چشمہ اتار کر پھر سے پہنا۔ اور پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھا تالان تک پہنچا۔

”کیسے ہیں جناب؟“ بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

”جی میں... جی میں... جی میں...“ خوشی سے آواز اس کے گلے میں اس طرح پھنسی کہ پورا جملہ باہر نہ آسکا۔ قہقہہ پھر لگا۔

”اچھا... اچھا... ٹھیک ہے ہم سمجھ گئے۔ آپ بہت اچھے ہیں۔“ بڑی شوخی سے بولی۔

جمشید نے آنکھیں پٹپٹائیں اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

”ایک کام ہے۔ کریں گے؟“ انداز دلبری سے پوچھا گیا۔

سر پھر فٹا فٹ اثبات میں ہلا۔

”یہ ہمارا سامان اوپر تک لے چلیں۔ سچی سفر سے

اتنے تھک گئے ہیں۔ ہلا تک نہیں جاتا۔“

”کیوں نہیں چکیوں نہیں۔ میں سب لے جاؤں گا۔“

اس نے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے اٹیچی کیس اٹھالے۔ شمشاد نے جلدی سے سفری گولہ اس کی گردن میں لٹکا دیا۔ ارشاد نے ہینڈ بیگ اس سے راز میں

کاندھے پر رکھ دیا۔

”یہ کمبل؟“ دلشاد نے پوچھا۔

”ان کے سر پر رکھ دو۔ کیوں جمشید صاحب؟“

”بالکل بالکل۔“ اس کی پھنسی چھنسی آواز آئی۔

”ہاں ہاں جوان! تگڑے آدمی ہیں۔ کوئی اتنے سے سامان سے ان کی پچی تھوڑا ہی ٹوٹنے والی۔“ چھوٹی

ارشاد نے ٹکڑا لگایا۔

”جوان! اور “تگڑے“ کے الفاظ نے اس کی کچلتی

کمر کو کافی سہارا دیا۔ لیکن چشمہ حسب معمول سرک کر ناک کی پھنگ پر جا پہنچا۔

”مم... میرا چشمہ...“

”اتار لے شمی!“

شمشاد نے لپک کر چشمہ اتار لیا۔

”مم... میں دیکھوں گا کیسے؟“ اس نے پھولی ہوئی

سانسوں میں پوچھا۔

”ہم لیے چلتے ہیں جناب یہ دیکھیں آپ کا بازو

پکڑ لیا۔“

”ہی ہی ہی...“ اس کی ہنسی نکلی۔ ”مم... مجھے گد

گدی ہوتی ہے۔“

”ہمیں بھی تو ہو رہی ہے ہم کوئی ہنس رہے ہیں؟“

یہ دلشاد بھی جس نے مسکراہٹ مشکلوں سے ضبط کی

ہوئی تھی۔

دونوں جانب سے اس کے بازو تھام لیے گئے تھے۔

بوجھ کا سارا احساس ہوا ہو گیا تھا۔ شرابی شرابی

مسکراہٹ کے ساتھ کمر لپکا مٹکا کر اس نے سیڑھیاں

طے کیں۔

”امی جی! اسیں آگئے۔“ ارشاد نے آواز لگائی۔

”ہائے نی!“ میں صدقے... میں واری۔ میری

کڑیاں چنگے ویلے پہنچی آں۔“

نوربانو خوشی سے بے حال ہو کر آگے بڑھیں پھر
تھک کر رک گئیں۔ ”ہائے وے رہا ایس بے
چارے داکہ حال کیتا اے؟“ وہ حیران نظروں سے
جہشید کو دیکھنے لگیں۔ جبکہ لڑکیاں سیاری دادی جان کو
سامنے بیٹھا دیکھ کر سب شوخی بھول گئیں۔ وہ شعلہ بار
نگاہوں سے اپنے پوتے کا حال دیکھ رہی تھیں۔
شمشاد، دلشاد اور ارشاد نے فٹاٹ اپنا اپنا سامان

تھا۔

”میرا چشمہ۔۔۔“ اس کے لبوں پر بدستور مسکراہٹ
تھی۔

شمشاد نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑا چشمہ اس کی
آنکھوں پر لگا دیا۔ سب سے پہلے جو چیز اسے نظر آئی وہ
دادی جان تھیں۔ جہشید کو اپنی بصارت پر شبہ گزرا۔
اس نے جلدی سے چشمہ اتار کر صاف کیا اور پھر سے
لگایا۔ منظر حسب سابق تھا۔

”دوسری دادی۔۔۔ آ۔۔۔ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔
میں تو ان کا سامان۔۔۔ وہ میں جو ان گنگڑا آدمی نیچے کھڑا
تھا۔ آپ بوڑھی جان۔۔۔ یہاں کیوں۔۔۔ بیٹھی ہیں؟“
”کوئی نکال گروں سے!“ وہ لڑک دار آواز میں
بولیں۔ ”اور چل بیچے۔“

☆ ☆ ☆

”کم بختی مارے ناس مٹے مردار شرم نہ آئی تجھے؟“
دادی غضب ناک ہو رہی تھیں۔

”وہ دادی میں تو ان کی مدد۔۔۔“ وہ منمنایا۔

”ارے قلی ہے تو مزدور ہے کیا ہے؟“

”وہ دادی میں تو۔۔۔“

”گدھا ہے گدھا۔“ قطب الدین صاحب نے
نکڑا لگایا۔ ”پرائیوں کا بوجھ ڈھونڈا ہے۔ باپ دوائی کے
لیے بے حال ہوتا رہے اس کی بلا سے۔“

”میں دوائی لینے ہی جا رہا تھا ابو جی! رستے میں
وہ۔۔۔“

”ایسی بلائیں ہیں کم بختیں۔ میرے بچے کو خچر

بنا ڈالا۔ ارے تاج بالکل قلی لگ رہا تھا۔ قسم لے لو۔
پہلے تو میں پہچانی نہیں۔ چشمہ تک نہیں تھا چہرے پر
سینچو لگ رہا تھا۔“

غزل منہ دبا کر ہنس دی۔ اس کے ایک مکار پڑا۔

”میسنی۔۔۔ ہنس رہی ہے بڑا بھائی ہے تیرا۔“

”دادی آپ ہی تو مذاق بنا رہی ہیں۔“ وہ برا سامنے
بنا کر کندھا سہلانے لگی۔

”میں تو تیرے باوا کا بھی مذاق بنا سکتی ہوں۔ دادی
ہوں تیری۔ چل اٹھ جا کر نہا۔ بال کیسے چمکٹ

ہو رہے ہیں۔ اور سن لڑکے۔“

انہوں نے جہشید کو گھوڑا۔

”اگر آئندہ میں نے تجھے ان کا بوجھ ڈھوتے دیکھا تو
گلے میں رسی ڈال کر ان کے صحن میں باندھ آؤں گی۔“

”سمجھا؟“

”ان کے صحن میں؟“ اس کی باچھیں اس تصور
سے ہی کھل گئیں۔

پھر جلدی سے اس نے باپ کی طرف دیکھ کر گردن
جھکالی۔

UrduPhoto.com

☆ ☆ ☆

عشق و مزدوری عشرت کہہ خیر کیا خوب!
ہم کو تسلیم نہ کو نامی فرہاد نہیں

جنید نے ”دیوان غالب“ بند کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ بھائی جان کہ فرہاد کا کام عشق کرنا

ہے۔ مزدوری نہیں۔ عشق اور عشرت گاہ کی مزدوری

دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اب آپ کبھی شمو کی نگاہ

میں عاشق نہیں بن سکتے۔“

”یوں نہ کہو میرے بھائی۔“ وہ دل گداز انداز میں

بولی۔ ”ورنہ میں فرہاد کی طرح ہی چشمہ مار کر اپنا سر پھوڑ

لوں گا۔“

”چشمہ نہیں تیشہ!“ اس نے تصحیح کی۔

”ہاں ہاں وہی وہ ہوتا کیا ہے؟ کہاں سے ملتا ہے؟“

۳؎ تو اپنے ابا جان سے ورثے میں ملا تھا یا خسرو
نے ازراہ عنایت نیا نگور عطا کیا ہو گا۔ آپ کو — کچھ
خریدنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے جذبات اور
گزرتے واقعات کو باریک بینی سے دیکھتے ہوئے پیش
گوئی کی جاسکتی ہے کہ یہ کام از خود ہونے والا ہے۔
۴؎ چھا! اس نے جنید کی بات قطعاً نہ سمجھی اور
دلچسپی سے بولا۔ ”وہ کس طرح میرے بھائی!“
”دیکھتے جائے!“
۵؎ چھا وہ خط کا کیا بنا؟“

”آپ کے پاس ابھی خط خریدنے کے لیے رقم
کہاں ہے۔ فی خط پچاس روپے کی بات طے ہوئی
تھی۔“
”تو یار! ادھار کرلو۔“

۶؎ اس ادھار سے میں آپ کی محبت کی تنگ آؤں گے
سے پہلے ہی کاٹ دوں گا۔“
”اتنے سنگ دل بہت جو میرے بھائی!“ اس نے
آواز میں رقت اور سوز پیدا کیا۔ ”وہ حسینا میں محض
چند دن کی رخصت لے کر آئی ہیں۔“

”ہائیں؟ اللہ میاں سے؟“
”نہیں نہیں اپنے اپنے کالجوں سے انہیں پھر لوٹنا
ہے۔ کچھ دنوں میں اوپری منزل پھر میرے دل کی طرح
خالی ہو جائے گی۔“

”آپ کی ”اوپری منزل؟“ اس نے جمشید کی
کھوہری ملاحظہ کی۔ ”وہ تو پہلے ہی خالی ہے بھائی جان!
آپ کو کیا مغالطہ ہوا؟“
وہ بھنا کر رہ گیا۔

”تم خود کو غالب پارٹ ٹو تو نہیں سمجھنے لگے؟ بہت
اتزار ہے ہو؟“

”میں کسی شاہ کا مصاحب نہیں ہوں بھائی
جان!“ اس نے سر د آہ بھری۔ ”بجستہ خان کی
دوستی نے میرا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ دن رات ایک
کر کے نوٹس بنانا ہوں۔ وہ حسینہ ایک ادائے دلبری
سے مسکرا کر بغل سے فائل نکال لیتی ہے۔“
”حسینہ ہو کر بغل میں فائل رکھتی ہے؟ خنجر

نہیں؟“ جمشید نے حیرت سے چشمہ درست کیا۔
”میں اپنی بغل کی بات کر رہا تھا بھائی جان! فائل
چونکہ میری ہوتی ہے اس لیے میری ہی بغل میں ہوتی
ہے۔“
”تو وہ کیوں نکالتی ہے؟“

”ناکہ اسے بنے بنائے نوٹس مل سکیں۔ جو چیز اس
کے پاس نہیں ہے وہ اس کو استعمال کرنے کے متعلق
سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“ اس نے سر د آہ بھری۔
”اس کے پاس کیا نہیں ہے؟“

”جو آپ کے پاس بھی نہیں ہے اسے بنے بنائے
نوٹس درکار ہیں آپ کو لکھے لکھائے خطوط کی طلب
ہے۔“

”اور تمہیں کیا درکار ہے؟“ جمشید نے اسے

گھورا۔
”آہ!“ اس نے سر د آہ بھری۔

”یک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار کو دیکھ کر!
جمشید نے غصے سے سر جھٹکا۔

”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ اس نے دیوان
غالب کو گھورا۔ ”کوئی آسان سا شاعر ہونڈتے یار!“

”مسلام داوی!“
داوی اپنے تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز
تھیں۔ بازو آنکھوں پر رکھے وہ سستی سے لیٹی اونگھ
رہی تھیں۔ آواز پر اچھل ہی پڑیں۔ سامنے بلم کھڑا
مسکرا رہا تھا۔

”بہت تیرے کی مردار!“ وہ اٹھ بیٹھیں۔ ”چلا آیا تو
لبو ترانہ لے کر۔“

”ہی ہی ہی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
”اب ڈر لیا کر ہمیں دن رات۔“ وہ پنکھی اٹھا کر
بیزاری سے جھلنے لگیں۔

”میں پنکھا جھل دوں داوی۔“ وہ خوشامد سے بولا۔
”نہ! معاف رکھ ایک مرتبہ میرے کان پر ماری

تھی پکھی تو نے تو کہاں مل لگاتا ہے کام میں۔“

”پیر بادوں دادی؟“
”ہاں، تو گلابا ہمارا۔ تجھے کوئی پوچھنے والا ہے؟“
چل بیٹھ ادھر ذرا اب پیروں کو۔“ دادی اس کی چالپوسی سے کچھ راضی ہوئیں۔

وہ جھٹخت پر بیٹھ گیا۔ ان کی ٹانگیں اٹھا کر اپنی گود میں جو رکھیں دادی پیچھے کوالٹ کئیں۔
”ہی ہی ہی دادی کس کئیں۔“ وہ گھبرایا مکر اسے ہنسی بھی آگئی۔

گاؤ تیکے پر الٹی ہوئی دادی چلا میں۔
”مہمجت اللہ کی مار خبیث اٹھا مجھے سیدھا کر۔“
میں تجھے سیدھا کروں۔“ بلم نے لپک جھپک کر انہیں سہارا دے کر پھر سے بٹھایا۔
”چھڑی پکڑا میری!“

اس نے جلدی سے ان کی چھڑی اٹھا کر انہیں تھمائی۔
”مردا۔۔۔ ہاس پیٹے!“ پے درپے کئی وار انہوں نے اس کی پسلیوں پر کیے۔

”ہائے اللہ! مر گیا۔ دادی۔ لگتی ہے!“ وہ ہر وار پر اچھلا۔

”ارے! تو مونگ دل ہمارے سینوں پر۔“ انہوں نے تھک کر چھڑی پھینکی۔ ”مرے گا کیا۔“
اندر سے غزل جمشید اور تاج بیگم شور سن کر باہر نکلے۔

”کیا ہوا کیا ہوا دادی۔“
”ارے بلم!“ جمشید کی باچھیں کھل گئیں۔ ”تم آگے یار۔“

”ہاں! تو پھولوں کا ہار ڈال اس کے گلے میں۔ گھر کے دھندوں سے جان چھوٹی۔“ دادی طنز سے بویں۔
”شکر ہے بلم تم آئے۔“ غزل نے ناک چڑھائی۔
”تیرے منہ کے تو خندق ہے۔“ دادی نے اسے گھورا۔ ”گلی بلم بلم کرنے۔“

”ذرا سا آرام کر لو تو چین سنبھالو۔“ تاج بیگم کو مطمئن ہوا۔ ”چائے بنا کر برتن دھو لینا۔“

”بس یہی کرے گا اب سب کچھ سب ممکن ہوئے اس کے۔“ دادی بڑبڑائیں۔
بلم کو دیکھ کر سب ”ایزی“ ہو گئے تھے دادی کلس کر رہ گئی تھیں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک پیاری شمی!

سلام محبت (اول اول) پیش خدمت است! جمشید نے چشمہ شہادت کی انگلی سے پیشانی تک دھکیلا اور ناک بھوں چڑھائی۔
”یہ کیا لکھ دیا ہے؟ یہ تو خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”آپ پورا پڑھ لیں۔“ وہ مصروف انداز میں بولا۔
”آپ کو بعد میں سمجھ ہی لکھ دوں گا۔“
”اچھا!“ وہ مطمئن ہو کر پھر سے پڑھنے لگا۔
”تجھ سے قسمت میں مرنی صورت قفل ابجد“

تھا لکھا مات کے بنتے ہی جدا ہو جانا آپ ہمارے گھر میں آئیں یوں لگا گلستان میں بہار چلی آئی ہو۔ لیکن ابھی مشام جاں اس بہار کی خوشبو سے معطر بھی نہ ہو پائی تھی کہ آپ پڑھائی کا بہانا کر کے ہم سے دور چلی گئیں۔

”یار!“ جمشید نے تحریر پڑھنا ترک کر کے پھر سے چشمہ پیچھے دھکیلا۔ ”یہ تو بڑی گاڑھی گاڑھی باتیں لکھ ماری ہیں۔“ محبت ”تو بس پہلی لائن میں ہے۔ وہ مجھے گی کیسے؟“

”بھائی جان!“ اس نے کتاب پر سے سر اٹھایا۔ ”لڑکیاں ہمیشہ ٹیڑھا میڑھا آڑا تر چھا اظہار محبت پسند کرتی ہیں۔ سیدھی سیدھی بات انہیں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ مبہم بات پسند کرتی ہیں۔ مبہم!“

”اچھا!“ وہ مبہم مسکرایا۔ ”پھر آگے پڑھوں؟“
”پڑھے پڑھے۔۔۔ جو سمجھ نہ آئے پوچھ لیں۔“

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
”یار جنید!“ وہ پریشان ہوا۔ ”یہ مرنے مارنے کی
باتیں کیوں لکھ دیں یار! پیار محبت کی باتیں لکھو، عشق و
عاشقی کے قصے ہوں اور یہ شوخ کی جگہ شمشاد ہی لکھ دو
تو کیا حرج ہے؟“

”بھائی جان!“ جنید نے پین رکھ دیا اور اس کی
جانب متوجہ ہوا۔ ”میں نے پچاس روپے لے کر خط
آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے جو
”تشریف“ کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں اور اچھی طرح سوچ
لیں کہ شمشاد دل شاد اور ارشاد میں سے کیا لکھنا ہے۔
پہلا پہلا خط ہے، ابھی سوچ سکتے ہیں، بعد میں کوئی
چانس نہیں۔“

”اچھا!“ وہ فکر مندی سے بولا۔ ”ہاں! سوچ لوں۔
نہیں یار! شمشاد ہی ٹھیک ہے، جمشید جیسا ہی لکنا ہے
اور وہ ہے بھی سب سے پہلی سب سے گوری۔“
”ٹھیک ہے پھر نامہ بر کے متعلق بھی کچھ سوچا۔“

”وہ کون ہے؟“
”یہ تو آپ جانیں، مقصد یہ ہے کہ خط کیسے
بھجوائیں گے؟“
”پوسٹ کر دیتا ہوں۔“

”ماشاء اللہ! اوپر ہی منزل تو بہت چالو ہے آپ
کی۔ بناتیشے کے سر پھاڑنے کے نئے نئے طریقے سوچ
رہے ہیں آپ کو۔ وہ تو چلی جائے گی ہاسٹل میں اور پیچھے
سے بذریعہ پوسٹ پہنچنے والا خط انکل خورشید علی یا
آئی نور بانو ہی کھولیں گی۔ آپ نے شاید ان کے کچن
میں وہ مسالا پیسنے والی کوندی اور اس کا ہیلہ ڈنڈا نہیں
دیکھا۔ جب وہ لوگ سامان شفٹ کر رہے تھے تب
میں نے ہی وہ اٹھا کر اوپر پہنچائے تھے۔ اس دن سے
میں نے ان تین حسیناؤں میں سے کسی سے بھی محبت
کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا، لیکن آپ واقعی فرہاد کی
مانند جواں مرد ہیں۔ سہیل پوٹ فار یو!“

جمشید کچھ سوچنے لگا تھا۔
”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”میں نے سوچ لیا

”ہے۔“

”کیا؟“

”نامہ بر کا نام!“

”وہ کیا؟“ جنید نے اسے دیکھا۔

”بالم!“ وہ مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

”ارے اوچوٹے! ادھر آ مروو!“ دادی کی پاٹ وار
آواز اور خطرناک قسم کے تیوروں نے انگلی پر پکڑے
ڈالتے ہوئے بالم کو سہا دیا۔

”جی دادی۔۔۔“ وہ ڈرتا ہوا ان تک پہنچا اور ان کے
سرہانے رکھی ہوئی چھتری کو دوزیدہ نظروں سے دیکھنے
لگا۔

”میرے سرہانے سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا
ہے نا تو نے؟“ انہوں نے مشکوک نگاہوں سے اسے
دیکھا۔

”نہیں دادی۔۔۔ اللہ قسم۔۔۔ میرے باپ کی توبہ۔“
اس نے کان پکڑے۔

”خوب یاد ہے مجھے۔ پچھلے مہینے میں نے رکھا تھا
یہاں۔۔۔ ریزگاری پر می ہے لیکن نوٹ غائب ہے۔۔۔
پھر یہ جنید کا کام ہے۔۔۔ اسے ہی نوٹوں کی ضرورت ہے
آج کل۔۔۔ پرانی لڑکیوں سے مانگ لیتا ہے، دادی سے
مانگتے شرم آتی ہے کم بخت کو۔۔۔ چوری کرتے شرم
نہیں آتی۔۔۔ آنے دواسے، سمجھتی ہوں میں۔“
”بالم۔۔۔ یار بالنگے۔۔۔ جمشید نے کمرے سے سر
نکالا۔ ”یار! فارغ ہو تو ذرا آنا۔“

”تم اس قدر فراغت سے ہو تو اس غریب کو فارغ
ہونے کا موقع کہاں ملنا ہے۔“ دادی نے اسے جواب
دیا۔ ”یہ آیا اور سب کی غید ہوئی، بے چارا قربانی کا
بکرا۔“

”ہی ہی۔۔۔“ وہ شرما کر انگلی کے پاس سے پاکستانی
ہیروئن کی طرح بل کھا کر دوڑ چلا گیا۔
”نوٹنگی کہیں کا۔“ دادی اس کی حرکت سے جل
گئیں۔

”بھائی جان!“ اس نے اندر جھانک کر پوچھا۔

”میں آجاؤں؟“
جمشید بے تابی سے اس کی جانب بڑھا۔ بالم کا ہاتھ
کھینچ کر اس نے اندر کیا اور دروازے کی کنڈی لگادی۔
”ہائے اللہ بھائی جان! یہ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ

چلا آیا۔
”ارے چپ کرو۔“ جمشید نے گھبرا کر اس کے منہ
پر ہاتھ رکھا پھر جھلا کر ہٹایا۔ ”ایک تو یہ تمہارے
دانت۔“

”ہی ہی۔۔۔“ اس نے فوراً ”نمائش کی۔
”اندر کرو انہیں۔“

اس نے فٹ منہ بند کر لیا۔
”یار بالم!“ جمشید نے قدرے خوشامدی انداز
اختیار کیا تھا۔ ”ایک کام ہے تم سے کرو گے نا۔“
”سارے کام تو کر رہا ہوں بھائی جان! وہ ایک بھی
کروں گا۔“

”یار یہ۔۔۔ ایک۔۔۔ ایک کاغذ ہے۔۔۔“ اس
نے ڈرتے ڈرتے جیب سے تہہ کیا ہوا خط نکالا۔ ”یہ
کسی کو دینا ہے۔“
”کس کو دوں؟“ اس نے کاغذ اچک لیا۔ ”بابا جی
کو؟“

”ارے باپ رے۔۔۔ مرنے والے کا مردود؟“ اس نے
وادے کی زبان استعمال کی۔ ”اپنے ہر ایک کو
نہیں دینا کسی سے ذکر ہی نہیں کرنا اس کا۔“
”وادے سے بھی نہیں؟“

”او خبیث۔۔۔ حواسوں میں آجائے کیوں میرے
گلے میں رستی بندھوانے کی ترکیبیں سوچ رہا ہے۔“
”پھر بتائیں نا بھائی جان! کس کو دوں؟“ وہ اکٹا گیا۔
”یہ لے دس روپے تیری خرچی۔“ جمشید نے
ادھر ادھر دیکھ کر دس کانوٹ اس کے حوالے کیا۔

بالم خوشی سے چل اٹھا۔
”میں صدقے بھائی جان! میں واری۔“
”اب سن۔“ جمشید اس کے کان میں سرگوشیاں
کرنے لگا۔

”یار جنید! آخر جوانی محبت نامہ کب موصول ہوگا؟
میں انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گنتی بھونے لگا
ہوں۔“

”بھائی جان! عاشقی صبر طلب کام ہے۔ تمنا کی گوار
پر کان نہ دھریں۔“

جمشید نے جھین بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔
”تم کتنے بدل گئے ہو میرے بھائی! ایسی عقل
فراست پہلے کبھی تمہارے بے وقوفانہ سراپے سے نہ
جھلکی تھی۔ آخر اس تبدیلی کا راز کیا ہے؟ کہیں اس
نجستہ خان کی وجہ سے تو یہ تبدیلی نہیں آئی؟“
جنید نے سر آہ بھری۔

”درست اندازہ لگایا آپ نے بھائی جان! یہ سب
اسی نجستہ خان کے کرشمے ہیں۔“

”واہ میرے بھائی! محبت ہو تو ایسی آلو کو لومڑی بنا
ڈالا۔“

جنید نے تکیے سے سر اٹھا کر بد مزگی سے اسے
دیکھا۔

”مثال دینے میں تو آپ ہمیشہ سے بے مثال رہے
ہیں بھائی جان! ویسے اطلاع عرض ہے کہ یہ محبت کا
نہیں رقابت کا کوشش ہے۔ یہاں وفا نہیں جفا سرگرم
عمل۔۔۔ وہ دھوکہ باز حسینہ میرے سب لوہے لپے
ہضم کر گئی جیسے کسی مشہور ماہنامے کی ردی کی ٹوکری
ہو اور میرے سامنے وہ ڈکارتی نا بھی گوارا نہیں کرتی۔“

”چچ چچ۔۔۔ جب ہی میں کہوں کچھ دن سے
تمہاری صورت کلوادھولی کے گدھے جتنی بی کیوں
لگ رہی ہے۔ تو یہ ہے اس کا سبب۔ غم نہ کرو میرے
بھائی! میں تمہارے اس غم میں برابر کا شریک ہوں۔“
”رہے ہیں بھائی جان! یہ شراکت داری آپ کو
راس نہ آئے گی۔ ابھی آپ کو ”پ“ غم کا بوجھ بھی
پورا پورا اٹھانا ہوگا، کیونکہ میں اس میں ہرگز شراکت
داری نہ کروں گا۔ کلوادھولی کے گدھے کا ذکر اس
وقت تک کے لیے اتھار رکھیں۔“

اسی لمحے بالم اپنی پتلی کمر پر چکنا چکنا وہاں سے گزرا۔
”ارے رے رے۔۔۔ سنو بالم۔۔۔ او بابائے۔۔۔“

جمشید نے گھبرا کر اسے آوازیں دیں۔

”چائے کا وقت گزر چکا ہے بھائی جان! باجی کہہ
رہی تھیں چائے صرف دو ٹائم بنے گی۔“ وہ مصروف
انداز میں تھہر کر بولا۔

”ارے توپ کا گولہ مارو چائے کو“ ادھر آؤ تم۔“ وہ

جھلایا۔

”جی، کیسے۔“ بالم نے قریب آکر کہا۔

”وہ۔۔۔ وہ دے دیا؟“

”وہ۔۔۔؟ وہ کیا؟“ وہ الجھ کر بولا۔

”ارے وہی۔۔۔ وہی۔۔۔“

”خط کہہ دیجئے بھائی جان! کوئی حرج نہیں۔“ جنید

کھل کر بولا۔

”وہ میرا خط۔“ وہ دبی آواز میں بولا۔

”ہاں جی“ آئی کو دے دیا۔“ وہ کہہ کر جانے لگا تھا۔

”ہائیں؟“ وہ دونوں ہکا بکارہ گئے۔

پھر جمشید نے جست لگا کر اس کی گدی پکڑی۔

”کیا بیک رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بھائی جان! جھوڑیں مجھے۔۔۔ باجی۔۔۔ داؤ کی۔۔۔“

آوازیں دینے لگا۔

جنید نے لپک کر اس کا ہاتھ بندھ لیا۔

”اے چپ کر ورنہ دوں گا ایک مکا۔“

وہ سہم کر خاموش ہو گیا۔

”ہاں اب بتا۔“

”جمشید بھائی جان نے کہا تھا وہ جو سب سے گوری

باجی ہیں، ان کو وہ کانغہ دے دینا۔ میں اوپر گیا تو انکل

خورشید چاچامیاں اور آئی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

ان میں سب سے گوری آئی تھیں، تو میں نے وہ کانغہ

ان کو دے دیا۔“

”ہاں۔“ جمشید تورا کر بستر پر گر گیا۔

”اے بے وقوف!“ جنید نے اسے ایک دھب

رسید کی۔ ”بھائی جان نے ان کی بیٹیوں کے لیے کہا

تھا۔“

”تو جی۔۔۔ وہ تینوں تو واپس چلی گئی ہیں۔۔۔ میں ان کو کیسے دیتا؟“ وہ گردن سہلائے لگا۔ جنید مظلوم صورت بنا کر کچھ سوچنے لگا۔

”ہاں بس۔۔۔“ اس نے ناک چڑھائی۔ ”ایسے ہی فضول فضول موقعوں پر بہن کی یاد آتی ہے۔ ویسے تو کبھی میرا نام نہیں لیتے آپ دونوں اور بھائی جان! کتنی خراب حرکت کی ہے آپ نے۔ اب میرا سامنا ہو گا ان لڑکیوں سے تو مجھے کتنی شرم آئے گی۔“

”پہاری بہنا! افسوس کا مقام تو یہی ہے کہ ان لڑکیوں تک بات پہنچی ہی نہیں۔“ اس نے آہ بھری۔

”وہ ایک معصوم سا اظہار محبت تھا‘ سومن چرس تو نہ تھی جو رستے میں ہی دھری گئی۔“

”تو اب میں کیا کروں؟“ وہ بھنائی۔ ”اور میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟“

”تم اوپر جا کر حالات کا جائزہ لے کر آؤ۔ حالات و تاثرات و واقعات نوٹ کر کے ہمیں سہری دو۔“ جنید بولا۔

”معاملات کس قدر بگڑ چکے ہیں‘ باریک بینی سے مشاہدہ کرو۔ بات بننے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے‘ مشورہ دو۔“

”ہاں۔۔۔ میں مار کھاؤں۔۔۔ آپ دونوں چھپے بیٹھے

رہیں۔“

”نہیں میری بہن۔۔۔ یقین کرو۔۔۔ ہم مار کھانے میں تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔“ جمشید جذب سے بولا۔ غزل نے غصے سے سر جھٹک دیا۔

غزل جاں فزار پورٹ لے کر آئی تھی۔ ان دونوں کے مرجھائے ہوئے چہرے جی اٹھے۔

”آئی کو تو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ انہوں نے نا ججھی سے وہ کاغذ ڈائمنگ میبل پر نمک دانی کے نیچے رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن ان کا ارادہ ہے کہ وہ شام کو خورشید انکل سے وہ تحریر پڑھوائیں

گی۔ دراصل وہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ کاغذ شمشاد بانی کی پڑھائی سے متعلق کوئی چیز ہے۔“

”اوہ۔۔۔ کس قدر درست سمجھتی ہیں وہ۔“ جمشید نے دانت نکالے۔ ”واقعی وہ ‘‘نہی‘‘ کی پڑھائی کی چیز ہے۔“

”دانت اندر کریں بھائی جان اور یہ سوچیں کہ وہ خط واپس کیسے لیا جائے۔ خورشید انکل‘ آئی نور بانو جیسے ساہو لویج ہرگز نہیں ہیں۔“

”تم کئی تھیں تو لے آئیں۔“ جمشید غزل پر بگڑا۔

”جی ہاں۔ احسان ماننا تو ایک طرف۔۔۔ لے کے الزام دھرنے۔۔۔ میں بھلا کیسے لے آتی؟ اتنی بات بھی میں

نے بڑی مشکلوں سے اگلوائی ہے‘ وہ تو نجانے کیا کیا بولتی رہتی ہیں۔ وہ تو شکر کریں جس وقت بالم خط لے کر آیا‘ خورشید انکل کا ضروری فون آگیا‘ ورنہ وہ تو اسی

وقت ان سے پوچھوا لیتیں۔ اب انہوں نے انکل کے انتظار میں اسے ڈائمنگ میبل پر رکھ چھوڑا ہے۔“

”کچھ کرو میرے بھائی!“ جمشید نے آہ بھر کر جنید کو دیکھا۔

وہ سوچنے لگا۔

”ان کی ڈائمنگ میبل لاؤنچ کی مغربی دیوار سے لگی رکھی ہے۔“ جنید پر خیال انداز میں بولا۔

”ہاں وہاں بیٹھ کر وہ مزے مزے کے کھانے کھاتی ہیں۔“ جمشید بھی خیالوں میں مسکرایا۔ جنید نے اسے

بری طرح سے گھورا۔

”اپنے تصور کی دنیا فی الوقت اس کو ندی اور پہاڑ ڈنڈے سے آباد کیجئے بھائی جان! جو ان کا کھانا پکانے میں

استعمال ہوتا ہے۔ اس سے آگے جانا منع ہے۔“

”صحیح کہتے ہو برادر م!“ اس نے سرد آہ بھری۔

”اس کے کو ندی اور ڈنڈے کے ساتھ ساتھ میرے تصور کے کینوس پر‘ دادی جان کی چھٹری اور ابو جی کا جوتا

بھی پینٹ ہو چکا ہے۔“

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دیوار میں ایک کھڑکی

ہے۔ جس کے پٹ چوبیس گھنٹے دار ہوتے ہیں۔“

”اچھا تو پھر؟“

”اس کھڑکی کے قریب سے ایک موٹا پائپ گزرتا ہے۔“

”بمقصد نکاسی۔“ جمشید نے سر ہلایا۔

”تو۔ بھائی جان۔ اگر آپ اس پائپ کے سہارے چڑھ کر اس کھڑکی تک جا پہنچیں۔ تو ایک ہاتھ کے فاصلے پر میز بڑی ہے۔ میرا مطلب ہے۔“

”برادر عزیز۔“ جمشید نے اسے گھورا۔ ”تم جانتے ہو کہ وہ پائپ لائن ٹوائلٹ کی ہے اور تین جگہ سے لیک ہے اور سوئے اتفاق اگر اس وقت چاچا میاں ٹوائلٹ میں ہوئے تو جانتے ہو میرے ساتھ کیا ہوگا؟

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ثابت کرے گی کہ موت زہریلی گیس سے ہوئی ہے۔“

”لیکن بھائی جان! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو بہر حال بن کر رہے گی۔ خواہ اس میں لکھا ہو کہ موت سر کے پچھلے حصے پر کوئی وزنی چیز مارنے سے ہوئی ہے۔“

”کیسے بھائی ہو تم! اس نے نہ نظر آئے والے آنسو پوچھے۔“ اتنی سی بات کے لیے تم میرا جان و ایمان دونوں کا نقصان کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ آخر تمہاری بے مثال ذہانت کیا ہوئی۔ نیمز بانڈ کی اتنی فلمیں دیکھ کر تم نے کیا سیکھا؟“

”جوش نہ دلائے بھائی!“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”وہ معمولی کاغذ حاصل کر لینا تو یوں چٹکیوں کا کام ہے۔“

جمشید مسکرا کر لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

”یہ دیکھیے بھائی جان!“ جنید نے ایک سفید کپڑا سا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”آپ کے مسئلے کا بے داغ حل۔“

”ہائیں۔“ جمشید نے اس کے ہاتھ سے وہ کپڑا سا لے کر بغور معائنہ کیا۔ ”یہ گاؤ تکیے کاغلاف؟ اور اتنا بڑا اور پھٹا ہوا۔ اس سے کیا ہوگا؟“

☆ ☆ ☆

”بھائی جان! اگر یہ گاؤ تکیے کاغلاف ہے تو وہ گاؤ تکیے ہمارے پیاری دادی جان ہیں۔ یہ ان کا قدم اور خاندانی برقع ہے بھائی جان! یہ جالی دار ٹوپی دیکھ رہے ہیں اس میں ہوا کی نکاسی کا کس قدر عمدہ انتظام رکھا گیا ہے اس کو پہن کر دکھائیے۔“

اس نے آگے بڑھ کر وہ برقع جمشید کو پہنا دیا۔

”ہائیں۔ ارے۔ اف۔۔۔ یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ وہ جالی میں سے جھانکنے لگا۔

”کیسے، کیسی ترکیب ہے؟ لیکن ٹھہرے آپ کی مونچھیں پر اہلیم کر رہی ہیں۔ ان کو اندر ہی رکھیے نا۔ یہ جالی سے باہر کیوں آرہی ہیں۔“

”اتنی زور زور سے سانس لوں گا تو مونچھیں تو اڑیں گی ہی۔“ اس نے برقع اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔

”یہ اپنے بس کا روگ نہیں ہے برادر عزیز! اس کو پہنا تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کہے گی کہ موت دم گھٹنے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔“

”آپ تو بالکل ناکارہ ہیں بھائی جان!“ اسے غصہ آیا۔ ”چلے تھے محبت کرنے، خبردار جو آپ نے آئندہ محبت کا نام لیا۔“

☆ ☆ ☆

”اوبھنے۔ میں اندر آسکتی آں؟“ اس نے منہ کمرے میں گھسیٹ کر سختی آواز میں پوچھا۔

”کون اے؟“ وہ بولیں۔

”میں جی۔۔۔ اک غریب عورت آں۔“ وہ سفید برقع میں لیٹا اندر چلا آیا۔ ”تراہ لگی سی۔ پانی واسطے آئی آں۔۔۔ پلا دو جی۔۔۔“

”آہو بھنے۔ ضرور پیو۔۔۔ شربت پیو۔۔۔“ وہ اٹھ کر فریج تک گئیں۔

جنید نے برق رفتاری سے میز پر نمک دانی کے نیچے رکھا کاغذ پھینچ کر مٹھی میں دو بوجا۔

”اندر سے نکلتے چاچا جی نے اس کی حرکت دیکھ لی۔“

”اوپ۔ کون اے تو۔۔۔؟“ وہ خطرناک تیوروں سے اس کی جانب بڑھے۔ ”کی چکھا ایتھوں؟“ (پہل)

سے کیا اٹھایا)
 ”میں جی۔ میں جی۔“ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی
 کوشش میں کرسی پر گر پڑا۔
 چاچا جی کی نظر اس کی جینز اور پشاوری چپل پر
 پڑی۔

”اے کینے میں دسائے تینوں سوچو رہا ہے۔“
 وہ اس کو پکڑنے لگے۔ جنید برق رفتاری سے کرسی
 سے اٹھ گیا۔ چاچا جی کرسی پر جا کرے۔ آنٹی اور بانو
 حیران پریشان سی ساری کارروائی دیکھتی رہ گئیں۔
 وہ برج تھوڑی پر کس کر پکڑے ہوئے وہاں سے
 بھاگا۔

”چور چور۔ پکڑو پکڑو۔“ چاچا جی پیچھے تھے۔
 وہ صحن میں پہنچ کر برق رفتاری سے سیڑھیوں کی
 ریلنگ پکڑ کر نیچے کود گیا۔ صحن میں سوئے اتفاقاً خوش
 قسمتی کوئی نہ تھا۔ وہ ایک چھلانگ مار کر اپنے کمرے
 میں گھس گیا اور کنڈی چوٹھا کر گہرے گہرے سانس
 بھرنے لگا۔

”بچ گئے استوار۔“ وہ خود سے بولا۔
 چاچا جی بھی اپنا لباس سنبھالتے اسی کی طرح
 سیڑھیوں سے کودے تھے لیکن اگلے ہی لمحے ہاتھ روم
 سے غسل کر کے باہر نکلتی داوی جان سے ٹکرائے۔
 ”ہائیں۔“ داوی ہکا بکارہ گئیں۔

پھر وہ مارے غصے کے لال ہو گئیں۔
 ”نخبیٹ کہیں کے، موئے لفتکے تیری یہ ہمت۔“
 ”او چاچی جی۔ وہ۔ چور۔“ چاچا جی کے اوسان
 خطا ہو گئے۔

”رستم کی اولاد۔ میں بتاتی ہوں تجھے۔ تو آیا کیسے
 میرے صحن میں۔“ داوی جان اپنا آزمودہ ہتھیار
 سنبھالے ان کے پیچھے لگیں۔

”بچاؤ۔ مینوں بچاؤ کوئی۔“ چاچا جی وہائیاں دے
 رہے تھے۔

”لایے، دیجیے پانچ سو کا پتہ اور لے لیجئے اپنا محبت
 نامہ۔“

”پانچ سو؟“ جمشید ہونق ہو گیا۔ ”میرے پورے

مہینے کی پاکٹ منی مانگ رہے ہو؟“

”کیا سمجھ رہے ہیں آپ؟“ وہ طنزاً بولا۔ ”پورا
 پورا کمائڈو ایکشن تھا۔ کسی قسم کی گارنٹی نہ تھی، جان
 اور عزت دونوں سخت خطرے میں تھیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ جمشید منمنایا۔
 پانچ سو کا نوٹ ہتے آنسوؤں کے ساتھ دے کر اس
 نے اپنا خط لیا۔

”ہائیں۔“ کانغذ کھول کر وہ ہونق رہ گیا۔ ”یہ کیا
 ہے؟“

جنید لپک کر اس کے قریب آیا۔
 ”گو بھی ایک کلو۔“

مشرود کلو

ٹماٹرود کلو

ہراوحنیا

”یہ کیا ہے؟“ وہ چلا آیا۔ ”پانچ سو روپے میں یہ سبزی
 کی لسٹ؟“

”لیکن بھائی جان۔“ وہ پریشان ہوا تھا۔

”ماغ خراب ہو گیا ہے عتو کا۔“ تاج بیگم سبزی
 کی ٹوکری لیے ہستی ہوئی آ رہی تھیں۔ جمشید نے
 جلدی سے کانغذ چھپایا۔ جنید نے نوٹ جیب میں ڈال
 لیا۔

”کیا ہوا امی جان؟“

”ارے! عتو سبزی فروش آج بڑے موڈ میں تھا۔

ایک کانغذ سامنے رکھے لہک لہک کر شعر سنار ہا تھا۔ مجھ

سے کہنے لگا۔ ”باجی! مر جا غالب سنوگی؟“

”ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن۔۔۔ جنید

بولا۔

”ہاں ہاں۔۔۔ یہی شعر تھا۔“

”چلا گیا وہ؟“ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”ہاں، کب کا۔“ وہ ٹوکری سنبھالتی کچن کی طرف

چلی گئیں۔

دونوں بھائی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیے۔

